ام ہانیہ کا نیا ناول
میرا درد نہ جانے کوئ
WWW.BURNERNEWS.COM
BURNER NEWS

میرا درد نہ جانے کوئی

ام ہانیہ

"اماں! مان جانا دیکھ میں نے کون سی بڑی فرمائش کردی ہے جو تیرے بس میں نہیں۔ میں نے ایک چھوٹی سی ہی تو خواہش کی ہے پلیز مان جا۔" طاہرہ بیگم تہہ کیے ہوئے بستر اٹھا کے صحن کے آخری کنارے میں بنے اسٹور کی طرف لے آئیں۔ عطیہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"عطو! میں کہہ رہی ہوں نہیں لینا سرخ رنگ تو نہیں لینا۔ تم یوں میرے پیچھے پڑ کے میرا فیصلہ بدل نہیں سکتی۔" سارے بستروں کو نفاست سے سیٹ کر کے رکھتی اماں کے دوٹوک لہجے پہ اس کی بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں گدلے پانی سے بھرنے لگیں۔

"آخر آپ کو پورے خاندان کو اس سرخ رنگ سے کیا بیر ہے۔ کالج کے فنکشن میں اگر میں اپنی سب سہیلیوں کی طرح سرخ رنگ پہن لیں گی تو کیا قیامت آجائے گی بتائیں مجھے۔" آنسوؤں کے گولے کو اندر دھکیلتے ہوئے اس نے اماں کے سامنے تن کر روٹھے انداز میں پوچھا۔ طاہرہ جو بستر رکھ کے فارغ ہو چکی تھیں اسے سامنے تنے دیکھ کے جھلا گئیں۔

"ہٹو راستے سے میں نے ناشتہ بنانا ہے۔ اور وجہ تمہیں کتنی بار سمجھاؤں کہ ہمارے خاندان میں اچھا نہیں سمجھا جاتا غیر شادی شادی لڑکیوں کا سرخ رنگ پہننا۔ یہ بس سہاگنیں پہنتی ہیں۔ تم ابھی یہ رنگ پہن کے میری تربیت پہ ہنسنے کا موقع دینا چاہتی ہو لوگوں کو۔ برادری والے کیا کہیں گے کہ طاہرہ نے شہر آتے ہی بیٹیاں آزاد کر ڈالیں۔" طاہرہ اسے ہٹاتی ہوئی کچن میں آ گئیں۔ ساتھ ساتھ اسے ہزاروں بار رٹایا گیا قائدہ بھی ازبر کروانے لگیں۔

"اماں! آپ کے برادری والے تب کہاں تھے جب ابا ہمیں چھوڑ کے اس دنیا سے چلے گئے تھے۔ اور سرور بھائی اپنا بیاہ رچا کے ہم کو چھوڑ گئے تھے۔ تب تو کسی کو خیال نہیں آیا کہ چار بچوں کو آپ اکیلے کیسے سنبھال رہی ہیں کبھی پوچھ ہی لیں کہ ہم زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ اور آپ ان کی فکر میں دبلی ہوئی جا رہی ہیں۔" اس نے شیلف پہ چڑھ کے ٹانگیں جھلاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا تو فریج سے آٹا نکالتی طاہرہ کے ہاتھ میں کپکپاہٹ اتر آئی۔ انہوں نے خود پہ قابو پاتے ہوئے اسے ڈانٹ دیا۔

"عطیہ! گز بھر لمبی تیری زبان ہے۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہے یہ نہیں سمجھتی کہ دنیا کی مثال اس مکھی جیسی ہے جو زخم دیکھتی ہے بس غلاظت تلاش کرتی ہے۔ وہ دلوں کی پاکیزگی اور اخلاق کی عمدگی نہیں بس انسان کا عیب دیکھتی ہے۔ میں بس اتنا ہی تو چاہتی ہوں کہ تم سنبھل کے قدم رکھو تاکہ کسی کو کچھ کہنے کا موقع نا ملے۔" پراٹھے بناتے ہوئے وہ افسردہ لہجے میں بولیں تو عطیہ سر جھکا گئی۔

"ویسے عطو! تمہیں تو اماں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا ثمر کہ تمہاری سہیلیاں تمہارا خون آشام چڑیلوں والا روپ

کام رکھو سمجھے تم۔ امی! دیکھیں نا یہ ہمیشہ مجھے تنگ کرتا رہتا ہے۔" اچھل کے شیلف سے اترتی عطیہ اسے شکوہ کناں نظروں سے تکتی اماں کی مدد کروانے لگی۔ طاہرہ بس مسکراتی رہیں۔

"سرمد! مت تنگ کرو بہن کو چلو باہر جا کے دیکھ۔ ہارٹ فیل نہیں کروا دینیں ورنہ تو۔۔۔" کچن کے دروازے پر کھڑا کب سے ان کی باتیں سنتا سرمد اندر آتے ہوئے اس کے سانولے رنگ پہ چوٹ کرنے لگا۔

"تم بکواس بند کرو اپنی اور اپنے کام سے

www.burnernews.com

بیٹھو میں ناشتہ لاتی ہوں۔" پراٹھے بن چکے تھے وہ دو پراٹھے اور انڈے الگ الگ لنچ باکس میں پیک کرتی سرمد کو گھرکنے لگیں۔

"توبہ توبہ آج کل تو بھلائی کا زمانہ ہی نہیں۔ اگر مجھ پہ یقین نہیں تو کسی دن سرخ لپ اسٹک لگا کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو جانا۔ یوں لگے گا جیسے خون پیا ہو۔ اس پہ اگر سوٹ بھی سرخ کلر کا پہن لو گی تو کمزور دل لوگوں کو ہارٹ اٹیک کا خطرہ تو ہو گا ہی نا۔" وہ فریج سے سیب نکال کے دانتوں سے کترتے ہوئے اپنی بات دہرا کر ایک ہی جست میں کچن سے نکلتا چلا گیا۔ عطیہ نے پاس پڑا چمٹا اسی کی طرف اچھالا تھا جو فلائی کرتا ہوا سیدھا کچن سے نکلتے سرمد کے کاندھے پہ لگ کر زمین بوس ہو گیا۔ جہاں سرمد ہائی وائی کرتا کچن سے نکلا وہیں آگ بگولہ ہوتی طاہرہ نے اسے خوب لتاڑ دیا۔

"بے حیا لڑکی پاگل ہو گئی ہو کیا۔ ایک تو پہلے ہی ہمیں چھوڑ کے چلا گیا۔ اب سرمد کا ہی آسرا ہے اسی کی آس پہ میں تم تینوں کے فرائض نبھا سکتی ہوں۔ اور تم ہو کہ تمہیں ماں کی مجبوریوں کا بالکل احساس نہیں۔ ذرا سی ضد پہ تم بھائی کی جان کی دشمن ہو گئی ہو۔ کوئی حیا ہے تم میں کہ نہیں۔" زوردار آواز میں لنچ باکس بند کرتی طاہرہ نے اسے کھری کھری سنا ڈالی تھیں۔

"اماں! اگر ذرا سی ہی ضد تو آپ مان کیوں نہیں لیتیں۔ آپا کی یونیورسٹی میں فنکشن ہے اور سب سہیلیوں نے ایک رنگ پہننے کا ارادہ کیا ہے تو اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ پہننے دیں نا ایک رنگ ہی تو ہے۔" کچن میں لنچ باکس لینے آتی حبیبہ نے زمین بوس ہوئے چمٹے کو اٹھا کر عطیہ کے حوالے کیا اور مدبرانہ انداز میں طاہرہ بیگم سے کہنے لگی۔ جہاں طاہرہ میٹرک کی طالبہ اپنی کنجلی بیٹی کی باتیں سن کے ششدر رہ گئی وہیں عطیہ نے چھوٹی بہن کی بلائیں لیں تھیں۔

"تم چپ رہو۔ میں دیکھ رہی ہوں چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔ چلو یہ پکڑو اپنا اور ماریہ کا لنچ اور جاؤ اسکول۔" وہ چونکہ اسکول بس بس دودھ پی کر جاتی تھیں اس لیے حبیبہ لنچ پکڑتی باہر چلی گئی۔ حبیبہ اور ماریہ کے جاتے ہی ان تینوں نے ناشتہ کیا اور وہ سرمد کے ساتھ یونیورسٹی آ گئی۔ وہ اسے کالج چھوڑتا ہوا اپنی جاب پہ چلا گیا۔

✦✦✦

وہ لوگ گاؤں سے شہر کیا شفٹ ہوئے ان کے پیچھے رفتہ رفتہ سب رشتے دار شہر شفٹ ہو گئے۔ فیاض صاحب کو ایک کمپنی میں کلرک کی جاب مل گئی زندگی اچھی نہیں تو بس سادہ سی گزرنے ہی لگی تھی۔ ان کی پانچ اولادیں تھیں۔ سب سے بڑے سرور جنہیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کے چکر میں وہ دو دو نوکریاں کرتے تھے کہ اس کی پڑھائی کا خرچ اٹھا سکیں۔ خیال یہ ہی تھا کہ بیٹا سیٹ ہو جائے گا تو ان کا بازو بنے گا۔ مگر قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے بعض دفعہ وہ انسان کے گمان سے بالکل باہر ہوتا ہے۔ سرور فیاض کو جیسے ہی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب ملی سب میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی ان کا ہونہار قابل بیٹا جلد سیٹھ حشمت کو اپنی اکلوتی بیٹی فارینہ کے لیے بھا گیا۔ اور فارینہ جیسی طرح دار لڑکی کے لیے سرور انہیں چھوڑ کے اپنے سسر کا کئی ملکوں میں پھیلا بزنس سنبھالنے لگے۔ اسی دھن میں وہ ان لوگوں کو اپنی زندگی سے خارج کر بیٹھے تھے۔ انہیں بس ایک ہی لگن تھی حشمت صاحب کے کاروبار کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دینی ہے۔ ان کا حلیہ کیا بدلا تھا

ان کے دل و روح بدل سے گئے۔ اب انہیں ایک کلرک کو اپنے باپ کی حیثیت سے متعارف کروانا قابل ندامت لگتا تھا۔ اس لیے حشمت صاحب کے سرکل میں یہ ہی مشہور تھا کہ سرور کے ماں باپ لندن میں سیٹلڈ ہیں۔

یہ صدمہ فیاض صاحب سہہ ہی نہیں پا رہے تھے۔ جس ننھے پودے کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ جس کی مہنگی پڑھائیوں کی نظر ان کی سب بڑی کمیٹیاں ہوئی تھیں۔ جس بیٹے کو وہ باقی بچوں کے حصے کے نوالے بھی کھلاتے رہے، وہ یوں انہیں تنہا کر دے گا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

سرور سے چھوٹا سرمد ابھی میٹرک میں اور اس سے ایک سال چھوٹی عطیہ نویں کلاس میں تھی۔ جبکہ ماریہ اور حبیبہ بالترتیب پانچویں اور دوسری کلاس کی طالبہ تھیں۔ جب روڈ ایکسیڈنٹ میں فیاض صاحب چل بسے۔ پھر طاہرہ خاتون نے کیسے ان سب بہن بھائیوں کو کپڑے سی سی کر پڑھایا۔ کیسے یہ لوگ کم پیسے پہ بھی ٹیوشن پکڑتے رہے یہ الگ موضوع تھا۔ بہرحال دکھ کے دن کٹ گئے تھے۔ اب سرمد کمانے لگا تھا۔ اس نے بصد اصرار ان سے سلائی کا کام چھوڑنے کو کہا تھا۔ طاہرہ جیسے خود اس مشقت سے تھک سی گئیں تھیں۔ ان ہی دنوں عطیہ نے ایم اے انگلش میں ایڈمیشن لیا۔ طاہرہ جوش و خروش سے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن لوگ اس کی دبتی ہوئی رنگت کی وجہ سے اسے مسترد کر جاتے۔ اس دن بھی وہ صحن میں چارپائی پہ بیٹھی اس کے جہیز میں رکھنے کے لیے لائے گئے سرخ دوپٹے پہ ستارے لگا رہی تھیں۔ کچن میں برتن دھوتی وہ کئی بار اس سرخ دوپٹے کو دیکھ چکی تھی۔ تصور ہی تصور میں اوڑھ کر سارے صحن میں گھوم بھی چکی تھی۔ یہ وہ رنگ تھا جو اس کی دسترس میں ہوتے ہوئے بھی اس کے دل کی حسرت سا بن گیا تھا۔ طاہرہ کام میں مگن تھیں۔ عطیہ برتن دھو کے اندر جا چکی تھی جب طاہرہ کے پاس بیٹھتے سرمد نے کچھ جھجکتے ہوئے اپنی کلاس فیلو کا بتایا۔

"تو تم بھی اپنے بھائی کے نقش قدم پہ چلنا چاہتے ہو؟ تمہارا رشتہ لے جاؤں۔ تمہیں شادی کے لائق ہوتی بہن نظر نہیں آتی؟۔ اس کے لیے کوشش کرنے کی بجائے تمہیں اپنی پڑی ہے۔" طاہرہ کے لہجے میں دبا دبا اشتعال تھا جو سرمد کے اندر تک اکتاہٹ بھر گیا۔

"اب عطو کی شادی نہیں ہوتی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ کہیں لکھ کے رکھ لیں عطیہ کی شادی کبھی نہیں ہو گی۔ لوگ اس کی سیاہ رنگت دیکھتے ہی بھاگ جاتے ہیں کون کرے گا اس سے شادی۔" سرمد کا لہجہ یکلخت سفاکیت کی ساری حدود پار کر گیا۔ ان کے ہاتھ میں تھاما سرخ رنگ کا مہین دوپٹہ چھوٹ کر ان کے بری طرح لرزتے ہاتھوں سے پھسلا تھا۔

"تیرے منہ میں خاک سرمد! کیوں بری بھلی بولتا ہے بہن کے بارے میں۔ اک رنگت ہی کم ہے نا اس کی اور تو کوئی عیب نہیں۔ بس یہ طے ہے کوشش کر اس کی کہیں بات طے ہو تو میں طوبیٰ کے گھر تمہارا رشتہ لے جاؤں گی۔" طاہرہ نے درشتی سے کہا تو سرمد کو تشویش نے گھیر لیا۔

"اماں! تو کیا چاہتی ہے میں اس کلوٹی کے لیے کوشش کرتا رہوں اور طوبیٰ کے ماں باپ اسکی شادی کہیں اور کر دیں۔ اتنا پاگل سمجھا ہے مجھے اس سے اچھا نہیں کہ میں اس عطو کا گلا ہی دبا دوں۔" سرمد نے تلملا کر کہا تو طاہرہ کی سانس سینے میں اٹکنے لگیں۔ سرمد کا رویہ شروع سے بہنوں کے لیے ہتک آمیز تھا مگر اس کے اندر اتنا

www.burnernews.com

زہر بھرا تھا وہ سن کے دم بخود رہ گئیں۔ سرمد کو ایک لمحے میں شرمساری کے گہرے احساس نے گھیرا تھا۔ وہ بھاگ کے اندر سے انہیلر لے آیا جسے لیتے ہی طاہرہ بیگم کی سانس کچھ بحال ہوئی تھی۔

"اماں! تو کیوں فکر کرتی ہے میں ہوں نا۔ میں اپنی بہن کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ بلکہ میں ہی کیوں میں اور طوبیٰ مل کے عطو کے لیے اچھا سا رشتہ ڈھونڈیں گے۔ ابھی تو طوبیٰ کے گھر والوں سے بات کرو وہ تو تلے بیٹھے ہیں اس کا کہیں اور رشتہ کرنے کو۔" سرمد نے سرخ دوپٹہ گول کر کے چارپائی کی پائنتی کی طرف پھینکتے ہوئے بہن کے لیے مصنوعی التفات ظاہر کیا تو طاہرہ کے اندر خاموشی سرائیت کرنے لگی۔

پھر وہ جا کے سرمد کا رشتہ بھی ڈال آئیں ایک ماہ کے مختصر عرصے میں سرمد کی شادی بھی ہو گئی۔ طوبیٰ ویسی ہی تھی جیسی یونیورسٹی کی آزاد خیال لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اسے بس اپنی خوشی سے مطلب تھا۔ بوڑھی ساس تین نندیں اس کی نظر میں کچھ نہیں تھیں۔ وہ فارینہ کی طرح ان کے بیٹے کو ان سے چھین کے نہیں لے کر گئی تھی اور اس احسان کو بارہا ان پہ جتا چکی تھی۔ وہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ سب کاموں کی ذمہ داری ان ماں بیٹیوں پہ تھی۔ اس پہ بھی وہ ہر کام میں ہزار نقص نکالتی بات بات پہ ان تینوں بہنوں کو ذلیل کرتی سرمد خاموش تماشائی بن جاتا طوبیٰ حق سمجھ کے ان ماں بیٹیوں سے خدمت کرواتی۔ شاید وہ انہیں اس صورت احسان جتانے کا موقع دیتی تھی۔ سال بھر میں ہی طوبیٰ کی گود میں سارہ آ گئی۔ سرمد نے گھر خرچہ دیتے دیتے بالکل بند کر دیا تھا۔ یہ صورتحال طاہرہ خاتون کے لیے بالکل ناقابل برداشت تھی اس لیے انہوں نے مجبور ہو کر سرمد کو الگ کر دیا۔

اب طاہرہ خاتون کے پاس چپ چاپ دوبارہ مشین سنبھالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ پھر سے مشین کے ساتھ مشین بنتیں ان کی سانسیں ایسی الجھیں کہ تھم کر رہ گئیں۔ وہ تینوں آئی سی یو کے ٹھنڈے فرش پہ بلکتی رہ گئیں۔ وقت نے اتنی تیزی سے انہیں یتیمی کے گڑھے میں گرایا تھا کہ وہ تینوں وقت کے اس وار پہ انگشت بدنداں رہ گئی تھیں۔

+++

"تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ مجھ سے پوچھے بنا کھانا چوری کر رہی تھیں۔ تمہاری ماں نے یہ تمیز نہیں سکھائی کہ کسی کی چیزیں چھیڑنے سے پہلے اجازت لی جاتی ہے۔" تین کمروں اور ایک ڈبے جیسے اسٹور پہ مبنی یہ چھوٹا سا گھر جب الگ ہوا تو طے یہ پایا تھا کہ اسٹور کو صاف کر کے وہاں طاہرہ بیگم اپنا کچن سیٹ کریں گی۔ یہ طاہرہ کے قل کے دوسرے دن کی بات ہے جب ماریہ کے بھوک بھوک چلانے پہ وہ اٹھ کے کچن میں آئی تھی۔ شام ڈھلنے والی تھی وہ کل رات سے بھوکی تھیں۔ انہیں کھانے کا ہوش ہی کب تھا۔ مگر بھوک اچھے اچھوں کو ہوش کی دنیا میں لا کھڑا کرتی ہے ماریہ تو پھر تیرا سال کی بچی تھی۔ وہ کچن میں آ کر جیسے ہی کھانا نکالنے لگی ذرا سی کھٹ پٹ پہ بھناتی ہوئی طوبیٰ کچن میں آ گئی۔ عطیہ کے ہاتھ میں تھما ہنڈیا کا ڈھکن اس کے کپکپاتے ہاتھوں سے پھسلتے پھسلتے بچا تھا۔

"ماریہ کو بھوک لگی تھی میں کھانا نکالنے آئی تھی۔ تم فکر مت کرو ہم جلد اپنا کچن سیٹ کر لیں گے۔ اماں نا جاتیں تو میں یہاں آتی ہی نا۔" وضاحت دیتے ہوئے اس کا لہجہ گلوگیر ہوا تھا۔

"ہاں تو میں نے تمہاری بھوک کا ٹھیکا اٹھا

رکھا ہے۔ اپنا کچن سیٹ کرو اور خود بنا کے کھاؤ۔" دونوں ہاتھ کمر پہ جما کے کہتی طوبیٰ کے لہجے میں انسانیت مفقود تھی۔

"سرمد کی کمائی پہ ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا ہے۔ تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ وہ ہمارا بھائی ہے۔" اس نے سب ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے مدلل انداز میں کہا تو طوبیٰ کے چہرے پہ استہزائیہ مسکراہٹ سمٹ آئی۔

"اور تم یہ کیوں بھول گئی ہو کہ تم لوگ ہمیں الگ کر چکی ہو۔ تب تو بڑا اطمینان دکھا رہی تھیں تم لوگ کہ ہم نے اگر اپنا خرچ خود ہی اٹھانا ہے تو ہم الگ ہی بھلے اب کس حق سے میرے کچن میں گھسی ہو چلو نکلو یہاں سے۔" طوبیٰ نے اس کا بازو پکڑ کے اسے باہر نکالنا چاہا تو وہ جو کب سے ضبط سے کام لینے کی کوشش کر رہی تھی یکلخت جھلا کر پلٹی تھی۔

"تم مجھے کس حق سے اس کچن سے نکال رہی ہو۔ یہ گھر تم جہیز میں نہیں لے کر آئی تھی۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے اور میں اپنے بھائی کی کمائی کا رزق لے جانا چاہتی ہوں تم کون ہوتی ہو روکنے والی۔ سرمد آئے گا تو میں اسے سب بتاؤں گی۔" اس نے تنگ کر کہتے ہوئے دروازے کو تھام کر دھونکنی کی مانند چلتی سانس کو بحال کرنا چاہتا تھا۔ غصے سے کانپتا وجود اس کے اندرونی خلفشار کا گواہ تھا۔

"مر گیا ہے تیرا باپ جس کا یہ گھر تھا اب یہ گھر میرا ہے۔ جس بھائی کی تم مجھے دھونس دے رہی ہو وہ میری ہر بات مانتا ہے۔ تم بات کر کے گنوانا چاہو تو کوشش کر دیکھنا اب نکلو یہاں سے۔" طوبیٰ جو اس کی جرات پہ دنگ تھی تمسخرانہ انداز میں کہتی اسے کچن سے باہر دھکیل کر بنائے گئے کچن پلاؤ اور کڑاہی کو فریج میں رکھ کر لاک لگانے لگی۔ ایسا ہی ایک لاک اس نے کچن کے اس کیبنٹ کو بھی لگایا تھا جس میں گھر کا سودا تھا۔ وہ اب گھر کے اندر بھی کسی پہ بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا ہوا آپا! یوں منہ لٹکا کے کیوں آ گئی ہو۔" وہ لال بھبوکا چہرے کے ساتھ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی۔ بستر پہ لیٹی ماریہ نے نحیف و نزار لہجے میں پوچھا تو وہ من و عن ساری کتھا ان کے گوش گزار کر گئی۔

"ہم نے آپ کو وہاں کھانا لانے بھیجا تھا لڑنے نہیں بھیجا تھا۔ وہ ہم سے بڑی ہیں بھابھی ہیں ہماری اگر کچھ کہہ دیں تو ہمیں دو بدو ہونے کی بجائے مصلحت سے کام لینا چاہیے۔ لیکن آپ کو اپنے غصے سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہم بھی نہیں۔" حبیبہ نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کے ماری کو گلے لگایا تھا۔ اپنے بستر پہ سن سی بیٹھی عطیہ جیسے پتھر ہو گئی تھی۔

"حبیبہ آپی! بہت بھوک لگی ہے اب کیا کریں گے ہم۔ میں تو مرنے والی ہو گئی ہوں۔" ماریہ اشکبار نظروں سے حبیبہ کو دیکھتی پوچھنے لگی۔

"میں ہوں نا تمہارے ساتھ فکر کیوں کرتی ہو۔ بھائی بھی آ گئے ہوں گے چلو ہم چل کے بات کرتے ہیں۔ معافی بھی مانگ لیں گے اور کھانا بھی لے آئیں گے۔" حبیبہ اسے پچکارتی ہوئے ساتھ لگائے کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں بریانی کی پلیٹ تھی۔ جس سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبو اس کی بل کھاتی آنتوں کی آزمائش بن گئی مگر اسے کسی نے جھوٹے منہ بھی نا پوچھا۔ وہ ساری رات اپنے نصیب پہ سسکتی رہی۔

+++

www.burnernews.com

دوسرے دن اس نے امی کا پرس دیکھا تو اس میں دو ہزار روپے تھے۔ شاید کسی مشکل وقت کے لیے سنبھال رکھے تھے۔ کچھ مطمئن ہوتی وہ چادر اوڑھتی بازار آ گئی۔ ڈبل روٹی جام اور دودھ کا پیکٹ خرید کے گھر آتے ہی بہنوں کو جگایا اور ان کے تیار ہونے تک جام سلائسز پہ لگا کے دو کپوں میں دودھ انڈیلا اور ان کے سامنے رکھ دیا جس پہ حبیبہ اپنے رات والے رویے پہ ندامت کا اظہار کرنے لگی۔

''کوئی بات نہیں حبیبہ! زندگی جب آزمائش لینے پہ اتر آتی ہے نا تو اپنا سایہ بھی اپنا نہیں رہتا تم تو پھر تم ہو چھوٹی نا سمجھ سی بچی۔'' اس کے لہجے میں اتری یاسیت حبیبہ کو اپنے دل میں محسوس ہوئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں اسے خدا حافظ کہتی اسکول چل دیں۔

وہ بھی دل صاف کرتی اٹھ کے اسٹور میں آ گئی۔ دروازہ کھولتے ہی زمانے بھر کی دھول نے استقبال کیا۔ اسٹور میں ایک جانب پیٹیاں پڑی تھیں جبکہ فرش پہ بے ترتیبی سے رکھے صندوق اور فالتو کپڑوں کی گٹھڑیاں اس طرح دھری تھیں کہ اسٹور آدھے سے زیادہ اسی سامان سے گھرا ہوا تھا۔ کچھ کاٹھ کباڑ بھی تھا جو باقی آدھے اسٹور کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس نے سب سے پہلے گلی سے گزرتے محلے کے بچے کو بلا کر اس کی مدد سے کاٹھ کباڑ محلے میں ہی موجود کباڑیے کی دکان تک پہنچایا۔ مہینوں سے جمع کاٹھ کباڑ کے ہی اسے پانچ سو روپے مل گئے۔ اس نے راستے میں گوشت اور چاول اور پیاز گھی وغیرہ معمولی مقدار میں لیے اور گھر آ گئی۔ پھر اسٹور میں آ گئی۔ بھاری صندوق پیٹیوں کے اوپر چڑھاتے اور اس پہ گٹھڑیاں جماتے اسے دو گھنٹے لگے۔ پھر اس نے کمر پہ دوپٹہ باندھا اور صفائی میں جت گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ چھوٹا سا اسٹور چمچما اٹھا۔

وہاں گیس کا کنکشن کرتے اسے دوپہر ہو گئی تھی۔ پھر اس نے جلدی سے ہاتھ چلاتے ہوئے تھوڑی سی بریانی بنالی۔ ماریہ اور حبیبہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں اس کے ہاتھ میں پلٹ دیکھ کے ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''ارے آپی! اتنے مزے کی بریانی کہاں سے آئی۔'' حبیبہ نے جیسے ہی چمچ بھر کر منہ میں ڈالنا چاہا اس نے راستے سے ہی جھپٹ لیا۔ حبیبہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا۔

''میں تو اپنے غصے سے زیادہ کسی کو عزیز سمجھتی نہیں نا پھر میری پلیٹ سے کھانا کیوں کھا رہی ہو۔ جاؤ نا اپنی پیاری بھابھی کے پاؤں پکڑ کے کھانا مانگ لو۔'' عطیہ نے نروٹھے انداز میں کہتے ہوئے امڈتے آنسوؤں کو روکا تھا۔ بلاشبہ حبیبہ کے یہ الفاظ اس کے دل کو داغ چکے تھے۔ حبیبہ نے بے بسی کے گہرے احساس سے مغلوب ہو کر ماریہ کو دیکھا۔

''ہاتھ پھیلانا بہت آسان نہیں ہوتا آپا! اور میں اسی دن یہ بات جان گئی تھی میں نے تو یہ بھی کر لی تھی۔ اب تو معاف کر دو بلکہ مت کرو معاف میں خود جا کے ہنڈیا سے اپنے حصے کی پلیٹ نکال لیتی ہوں۔'' اس کے گلے میں بازو ڈال کے مناتی حبیبہ نے یکلخت شرارت سے کہا تو جہاں ماریہ مسکرا دی وہیں عطیہ جلدی سے بولی۔

''میں نے تو بس اپنے لیے بنائے ہیں۔ اب تمھیں کہاں سے دوں؟'' زیر لب دبی شریر مسکراہٹ اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہی تھی۔

''ہماری آپی! ہمارے بنا کھا ہی نہیں سکتی یہ تو بات پکی ہے۔ اور حبیبہ آپی کو معاف کر دیں

ماریہ نے اس کے گلے میں بازو ڈال کے ہیں۔'' ماریہ نے اس کے گلے میں بازو ڈال کے لاڈ سے کہا تو وہ دونوں بہنوں کو گلے لگاتی کھلکھلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

کھانا کھاتی ہنستی مسکراتی تینوں بہنوں کو دیکھ کے طوبیٰ کے دل پہ جیسے سانپ لوٹے

ناشتہ کرتے ہی اس نے سلائی مشین سنبھال لی۔ سرمد اور طوبیٰ جو سمجھ رہے تھے کہ اب وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں پہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے گی۔ عطیہ کو حیرت سے بہنوں کا کفیل بنتے دیکھتے رہ گئے۔ اس نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا تھا۔ حبیبہ نے کالج میں داخلہ لیتے ہی کچھ ٹیوشنز پکڑ لیں۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ مگر طوبیٰ اپنی عادت سے مجبور تھی ہر چھوٹی بڑی بات کو جواز بنا کر ان سے لڑنا اور سرمد سے الگ گھر کا مطالبہ کرنا اس کا معمول تھا۔ عطیہ غلطی نا ہونے بھی معافی مانگ لیتی تھی۔ کہ بہر حال سرمد کا اس گھر میں رہنا ان کے تحفظ کی ضمانت تھی۔ وہ چاہے ان سے بنا کسی قصور کے معافی منگواتی مگر وہ ان کا بھائی تھا اس کے ہونے سے ان کی حفاظت تھی۔

وقت گویا پر لگا کے اڑا تھا۔ حبیبہ گریجویشن کر چکی تھی جب اس کا ایک بہت اچھی جگہ رشتہ طے ہو گیا۔ سرمد کو اللہ نے سارہ کے بعد اسمارا اور حیات کی صورت رحمت اور نعمت دونوں سے نوازا۔ سمارا تو اب پندرہ سال کی ہو رہی تھی۔ حبیبہ کی منگنی میں ہی راحیل کے گھر والوں نے ماریہ کا ہاتھ مانگا تو ہاں کروا کے ہی ٹلے۔ اس نے دونوں بہنوں کا اکھٹے فرض نبھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پیٹی میں جمع اپنا سارا جہیز دونوں

شگفتہ شگفتہ رواں دواں
اردو کی آخری کتاب
طنز و مزاح

آج ہی اپنے قریبی بکسٹال یا ہم سے طلب فرمائیں
لاہور اکیڈمی
محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ
اردو بازار لاہور

بہنوں میں برابر بانٹ کر انہیں رخصت کر دیا۔ وہ سارے جگمگاتے جوڑے جنہیں پہننے کی کبھی اس نے خواہش کی تھی۔ جگر جگر کرتے سرخ کاسنی اور سبز جوڑے جیسے اس کے لیے کبھی بنے ہی نہیں تھے۔

اس دن الماری کی صفائی کرتے ہوئے اس کے ہاتھ وہ سرخ دوپٹہ لگا جس پہ مرنے سے کچھ دن پہلے طاہرہ ستارے ٹانک رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں یکا یک گدلے پانیوں سے بھری تھیں۔ اس نے تھوڑی سی محنت کے بعد اس کے ساتھ کا کرتہ شلوار بھی ڈھونڈ لیا۔ بڑے دل سے اسے پریس کر کے اپنی الماری میں ٹانگ لیا۔ دوسرا اہم کام اس نے یہ کیا کہ خالہ سکینہ کو بلوا بھیجا۔ جنہوں نے اس کی بات سن کے اسے خوب تسلی دی تھی۔ وہ آس کے دیپ جلائے دن گننے لگی۔ ”جو سہاگنیں ہوتی ہیں وہ تو سرخ رنگ پہن سکتی ہیں نا اماں!۔۔۔“ سرگوشی کے انداز میں وہ اپنی ماں کے تصور سے مخاطب تھی۔

✦✦✦

”تمہیں پتا ہے آج گھر میں کون آیا تھا۔ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔“ سرمد آفس سے تھکا ہارا آیا تھا جوتے اتارے بنا بیڈ پہ نیم دراز ہو گیا۔ پاس ہی دھلے ہوئے کپڑے طے کرتی طوبیٰ طنزیہ مسکراہٹ لبوں پہ سجاتے ہوئے بولی تو سرمد جو ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹی وی آن کرنے لگا تھا ریموٹ رکھتے ہوئے چونک کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ باہر سے گزرتی عطیہ کے قدم بھی ناچاہتے ہوئے تھمے تھے۔

”تمہیں پتا ہے میں تھکا ہوا ہوں۔ کیوں تجسس پھیلا رہی ہو وہ بات بتاؤ جو تمہارے پیٹ میں مڑوڑ بن کے اٹھ رہی ہے۔“ طوبیٰ کی عادت سے بخوبی واقف سرمد جھلا کر بول

”رشتے کروانے والی خالہ آئی تھی آج۔ عطیہ نے بلایا تھا انہیں۔“ وہ لہجے میں پراسراریت سموئے یوں بول رہی تھی جیسے بہت بڑا دھماکہ کرنے والی ہو۔

”کیوں انہیں کیوں بلایا ابھی تو ہماری سارہ صرف پندرہ برس کی ہے اور پڑھ رہی ہے ابھی۔ ابھی تو میں ہرگز اس کی شادی نہیں کروں گا۔“ دوٹوک لہجے میں کہتے ہوئے معاملے کو اپنے تئیں سمجھتے ہوئے برملا انکار کیا تھا۔

”ارے بھولے بادشاہ! تمہیں کس نے کہہ دیا کہ تمہاری بہن کو تمہاری بیٹی کی فکر پڑی ہوئی ہے؟۔ سارا کے لیے نہیں اس نے اپنے لیے بلوایا رشتے والی کو۔“ طنزیہ لہجے میں کہتی طوبیٰ کے انداز میں عطیہ کے لیے اتنی تضحیک تھی کہ باہر کھڑی عطیہ سن رہ گئی۔

”کیا اپنے لیے؟۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔ عطیہ اب اس عمر میں شادی کر کے کیا کرے گی۔ اور سب سے بڑی بات اس کالی بھجنگ کو پسند کرے گا بھی تو کون وہ بھی اس عمر میں۔ اسے تو لوگ تب پسند نہیں کرتے تھے جب اس کی شادی کی عمر تھی۔ ایک دفعہ پتا کیا ہوا۔۔۔۔۔“ بے ہنگم قہقہے لگاتے ہوئے سرمد اب طوبیٰ کو یہ بتا رہا تھا کہ کیسے لوگ اس کی سیاہ رنگت کی وجہ سے انکار کر جاتے تھے۔

باہر کھڑی عطیہ کے سیاہ پاؤں بری طرح لرزتے تھے اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہو جاتی خود کو سنبھال کر کمرے میں آ گئی۔ اس نے نا جانے کیسی قسمت پائی تھی۔ ساری عمر جن بہنوں کے لیے رول دی۔ جس بھائی کے سایہ شفقت میں رہنے کے لیے وہ اپنی انا تک کو ختم کر گئی۔ وہ ہی لوگ آج تک اس کی خامی کو کسی جوتے کی طرح اچھال اچھال کے اس کے منہ پہ

مارتے رہے۔ وہ جوان کی زیادتیاں نہ سوچ کے بھول جاتی تھی کہ اپنے تو پھر اپنے ہوتے ہیں۔ وہ اس کی ایک شامی بھلانے کا ظرف نہیں رکھتے تھے۔

اس کا دل یکا یک مایوسی کے گرداب میں دھنسا تھا۔ سرمد ٹھیک کہتا تھا بھلا اس سیاہ رو کے نصیب میں سچی خوشیاں آ بھی کیسے سکتی ہیں۔ کافی دیر رونے کے بعد وہ میکانکی انداز میں چلتی ہوئی سامنے رکھی واڈروب کی طرف بڑھی۔ استری کر کے ٹانگا ہوا سرخ سوٹ نہا کے زیب تن کیا اور شیشے کے آگے بیٹھ گئی۔ لیکن یہ کیا جو لمحہ اس کے دل میں کسک بن کے ٹھہر گیا تھا وہ اس لمحے کو جی کر بھی محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے وجود سے لپٹا اس کا فیورٹ سرخ رنگ جانے کیوں اس کی حسرت کو سکون نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دل میں کسی خوشی کے احساس کو محسوس کرنا چاہا مگر وہاں مکمل خاموشی تھی۔ اس نے جنون کے عالم میں سوٹ سے میچنگ ہیل والا جوتا نکال کے پہنا۔ پھر بھی تشفی نا ہوئی تو میچنگ جیولری بھی چڑھا لی۔ لیکن خوشی تھی کہ اس کے دل کا راستہ ہی بھول گئی تھی۔ تب ہی باہر سے گزرتی طوبیٰ بڑبڑائی تھی۔ ”اونہوں بڈھی گھوڑی لال لگام“

اس نے شیشے میں دیکھا سانولی رنگت مگر پرکشش نقوش کی مالک عورت سر میں اکا دکا سفید بالوں کے باوجود قابل نفرت نہیں لگ رہی تھی۔ تب اس پہ یہ راز کھلا تھا کہ جیسے محبت میں سامنے والے کے عیب نظر نہیں آتے ایسے نفرت میں بھی مقابل کی بس خامیاں نظر آتی ہیں خوبیاں نہیں۔ اور وہ تو اتنی حرماں نصیب تھی کہ دنیا کی نفرت کا ہی نہیں اسے اپنوں کی نفرت کا بھی سامنا تھا۔

اس کے ذہن کے پردے پہ اس آیت کا ترجمہ چلنے لگے جس میں اللہ بزرگ و برتر نے تین بار قسم اٹھا کر یہ بتایا تھا کہ اس نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا۔ کوئی خامی دی بھی تو اس کے بدلے میں کئی صلاحیتوں سے نوازا۔ آج اڑتیس سال کی عمر میں وہ اس مقام پر کھڑی تھی کہ اس کا دل ریزہ ریزہ تھا۔ یہ وہ دوراہا تھا جہاں اگر وہ ہمت ہار کے اپنی نبض کاٹ لیتی تو خود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمام طعنوں طنزوں سے بچا جاتی۔ یا ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے بقا کی جنگ لڑتی اور یہ دیکھتی کہ اللہ نے تاحیات مصائب میں گزری قید با مشقت کا کیا اجر رکھا ہے۔ تب اس کے رب نے بہت پیار سے صبر کا امرت اس کے دل میں اتارا تھا۔ سیاہ پڑتی رات میں سب سے زیادہ روشن ستارہ امید کا ہی تو تھا جو مایوس دلوں کو زندگی کی طرف راغب کرتا تھا۔ رات کی اوک میں سجے چاند نے سرخ ستارے جڑے دوپٹے کے ہالے میں سمٹے اس کے چہرے کو مسکرا کر دیکھا تھا اور آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب مایوسی کے دن ختم ہونے کے قریب ہیں اور روشن راستے منتظر۔

✦✦✦

www.burnernews.com